التفسیر ، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹ شمارہ ۱۷، جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء

کیا غیر مذاہب کے تمام پیروکار باطل پرست ہیں؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج

Abstract

The way Quran has portrayed the Non-Muslims in its time of revelation has contineously been a subject of uderstanding the Quran which is multi dimentional in its vastness. Unfortunately, on a popular level it has been presented purely in a negative way and even more worse is that on the basis of this negative attitude, a wearisome war with the followers of other religions has been triggered. Ironically, by giving a title of "active Jihad" to this useless war, it is regarded as such a necessary requirement of the Quranic values which must be concluded in the form of political power. That is why all the struggle of the religious extremists is mostly focussed on gaining political

power.

Apart from the Quranic concept of Jihad, here we have to see only this point that the Quran has divided the followers of other faiths in two categories. First includes those who oppenly opposed the Muslims out of prejudice, and Second includes those who did not show any practical hostility like the first one. The former were called 'the infidels' while the later were called 'the non-Muslims' in the perspective of Islam and sometimes called 'the Muslims' in their own perspective.

The Quran has mentioned these followers of the later category in a very positive manner. Here we want to present some verses regarding this Quranic approach as an example. We feel that this precise collection of verses might be a beginning of a new Scholasticism (Ilm-ul-kalam) for the discussion with all the world religions, as well as a means of a positive introduction of the Quran to the west. My article is a reflection of such sincere sentiments and it should be seen in this context.

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وہ آخری الہامی کتاب ہے جس کے بعد صبح قیامت تک اب کوئی الہامی کتاب آنے والی نہیں۔ یہ ہمارے لیے اصولی ہدایات کا آخری سہارا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے جملہ معاملات میں اصولی ہدایات یہیں سے اخذ کرنا ہوں گی۔ سو اسی سہارے پر مذکورہ بالا عنوان کے ساتھ کچھ معروضات پیش خدمت ہیں۔

قرآن مجید نے اپنے زمانۂ نزول میں غیر مذاہب کے ماننے والوں کو جس رنگ میں دیکھا اور لوگوں کو دکھایا ہے۔ وہ قرآن فہمی کا ایک مستقل موضوع ہے اور اپنی وسعتوں کے اعتبار سے ہمہ جہت بھی۔ بدقسمتی سے عمومی سطح پر اس موضوع کو خالصتاً اور کلیۃً منفی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر غیر مذاہب کے پیروکاروں سے ایک تھکا دینے والی جنگ شاید غلط یا پھر غیر ضروری طور پر چھیڑ دی گئی ہے، جسے ستم ظریفی سے اقدامی جہاد کا عنوان دے کر قرآن کی کوئی ایسی مطلوبہ قدر بنا دیا گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ حکومتی اقتدار کی صورت میں ظاہر ہو۔ اسی لیے اب اکثر مذہبی شدت پسندوں کی تمام تگ و دو کا محوری نکتہ حصول اقتدار ہے۔

قرآن کے تصور جہاد سے قطع نظر کہ وہ اس ضمن میں مسلمان کو کیا تفصیلی ہدایات دیتا ہے سردست ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ قرآن نے غیر مذاہب کے پیروکاروں کو شروع سے ہی دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس سے از روئے حسد و بغض اور تعصب و جہالت مخالفت کا سامنا ہوا اور دوسرا وہ جس کی طرف سے عملاً ایسا کوئی معاندانہ رویہ سامنے آیا۔ ان میں سے پہلا حصہ کفار کہلایا جبکہ دوسرا حصہ اسلام کے تناظر میں غیر مسلم اور خود اپنے تناظر میں بعض حالات میں مسلم کہلایا۔

قرآن مجید نے غیر مذاہب کے انہی پیروکاروں کا نہایت قطعیت کے ساتھ مثبت انداز اور امید افزا لہجے میں ذکر فرمایا ہے۔ سردست ہم اسی تعلق سے چند آیات بطور نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مختصر سا مجموعۂ آیات در اصل تمام مذاہب سے مکالمے کے لیے جدید علم کلام کا ایک امید افزا عنوان ہے اور مغرب میں قرآن مجید کے مثبت تعارف کا ایک ذریعہ بھی۔ میرا یہ مضمون اسی دردمندانہ جذبے کا آئینہ دار ہے۔ از راہ کرم اسے اسی تناظر میں دیکھا جائے۔

(۱) لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓىِٕكَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا(۱)

لیکن ان میں سے جو پختہ علم والے اور ایمان والے ہیں وہ اس (وحی) پر ایمان لائے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور اس پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور (خصوصیت کے ساتھ) صلوۃ قائم کرنے والے اور زکوۃ ادا کرنے اور اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

اس آیت میں بعض یہود و نصاریٰ کو راسخون فی العلم اور مومنون کے وصف کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ گویا انھیں اپنے مذہب کا پہلے سے سچا مومن قرار دے کر قرآن پر ایمان لانے والا بتایا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مذہب میں سچے اور اچھے لوگ ضرور ہوتے ہیں اور وہ اپنے مذہب کے مومن ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کو ایک لکڑی سے ہانکنا خود قرآن کے خلاف ہے۔ کسی بھی مذہب کا اچھا آدمی بہر حال اچھا ہوتا ہے اور کسی بھی مسلک و نظریے کا برا آدمی بہر حال برا ہوتا ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے فی زمانہ اسے سمجھنے کی شدید ضرورت ہے۔

جس طرح دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بعض یہود و نصاریٰ اپنے علم میں راسخ اور مومن تھے یعنی برے مقلد کے طور پر اگلوں کے پیچھے چلنے والے نہیں بلکہ تحقیق پسندانہ رویے کے باعث قرآن کریم پر ایمان لانے والے بنے۔ مثلاً عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، زید بن سعید اور اسید بن عبید وغیرہم۔ اسی طرح زمانہ مابعد میں بھی ایسے راسخون فی العلم اور مومنون کا وجود غیر مستبعد ہرگز نہیں۔ یقیناً آج بھی اہل کتاب میں سے جو بھی راسخون فی العلم اور مومنون ہوں گے وہ ایک نہ ایک دن ضرور قرآن کریم پر ایمان لے آئیں گے۔ ماضی قریب و بعید میں اہل کتاب کے متعدد اصحاب علم و فضل نے اسلام قبول کیا

ہے۔ ہوریس لوکا ئے ، علامہ اسد، مارماڈیوک پکتھال جیسے بیسیوں نام ہماری تاریخ میں ہیرے کی طرح جگمگا رہے ہیں اور مستقبل قریب میں کتنے علمائے یہود و نصاریٰ مشرف بہ اسلام ہونے والے ہیں، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ واضح ہے کہ راسخون فی العلم سے مراد علماء اور المومنون سے مراد عام متبعین ہیں اور یہ دونوں اہل کتاب سے تعلق رکھنے والے گروہ تھے۔

(۲) اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَ
مَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۴)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی پیروی کرتے ہیں، جیسا کہ
پیروی کا حق ہے۔ یہی لوگ اس (قرآن) پر (بھی) ایمان لائیں گے
اور جو اس کا انکار کریں گے تو وہی لوگ گھاٹے والے ہیں۔

بعض مترجموں نے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ کا مصداق مسلمانوں کو قرار دے کر ترجمہ کیا ہے۔ اگر یہ مصداق درست سمجھا جائے تو پھر اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ کا مطلب ہوگا کہ صرف یہی وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید کو سمجھ کر عمل کرنے کی نیت سے پڑھنے والے ہی مومن ہوتے ہیں۔ اس مطلب کی رو سے مومن کا ایمان اس کے عمل تلاوت اور پیروی پر منحصر ہوگا۔ ہم نے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر آیت کا ترجمہ کیا ہے۔ مفتی تقی عثمانی کا ترجمہ بھی اس مفہوم پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

Those to whom we have given the book and they
recite observing the rights of its recitation. (۳)

اور جن لوگوں نے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ کا مصداق صالحین اہل کتاب کو قرار دیا ہے ان کی دلیل اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ کے الفاظ میں مضمر ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ مضارع کا صیغہ ہے جس میں ان کے ایمان لانے کی خبر دی گئی ہے اور اس طرح ان کے ایمان کو ان کی اپنی کتاب (خواہ وہ توریت ہو یا انجیل یا پھر کوئی اور) کی تلاوت کرنے پر منحصر کیا گیا ہے۔ ان دونوں مفاہیم کو تقی عثمانی نے اپنے حاشیہ میں بایں الفاظ درج کیا ہے۔

According to a report from the blessed sahabi Ibn Abbas(R.A), this verse was revealed on the occasion

of the arrival of forty christians from Abyssinia who had accepted Islam. But other commentators believe that " those to whom we have given The Book, are the blessed sahabah(R.A) and the book is the Holy Quran. As for reading the book "observing the rights of its recitation," it means correctly and clearly, and keeping the fear and love of Allah present in ones heart while reading and also the resolve to follow divine guidance and to obey divine commandments. The blessed second Khalifah (caliph) Umar (R.A) has said that reading the Holy Quran " observing the rights of its recitation" requires that when one comes to a description of Paradise, one should pray to Allah for granting one this abode. And when one finds a description of Hell, one should seek Aallah's protecion fom it. (۴)

(۳) اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ وَ اِنَّ
فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ (۵)

جنھیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچوں کو
پہچانے، ان میں کا ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے باوجود اس کے کہ وہ جانتا
ہے۔

یہاں اہل کتاب کے ایک فریق کو حق چھپانے کا مجرم قرار دیا گیا ہے، سب کو نہیں۔ اس سے یہ بات خود بخود نکلی کہ سب اہل کتاب ایک جیسے نہ تھے، ان میں ایسے بھی تھے جو حق کو بالکل نہیں چھپاتے تھے۔ انہی میں عبداللہ بن سلام جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

(۴) وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ

بِالْحَقِّ...(٦)

اور جنھیں ہم نے کتاب دی وہ اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے برحق اتاری گئی ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی اہل کتاب کے مثبت رویئے بلکہ مومنانہ طرز عمل کا ذکر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی دیگر آیات کے تناظر میں یہ ان اہل کتاب کے حق میں کہا گیا ہے، جو اپنی کتابوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے سبب اس امر کے گواہ تھے کہ آنحضرت کی بعثت سراسر حق ہے کیونکہ وہ تنزیل قرآن اور بعثت محمدی کی پیشگوئیاں اپنی کتابوں میں پڑھ چکے تھے اور یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام بھی لائے۔

(۵) وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْکِرُ بَعْضَهٗ...(٧)

جنھیں ہم نے کتاب (توریت و انجیل) دی ہے وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو کچھ آپ پر نازل ہوتا ہے (یعنی قرآن) تاہم (یہود و نصاریٰ کی) بعض جماعتیں اس کی بعض باتوں کی منکر ہیں۔

اس میں بعض اہل کتاب کی مدح بایں سبب فرمائی گئی ہے کہ وہ نزول قرآن پر خوش ہوتے ہیں۔ گو ان کے بعض گروہ قرآن کی بعض باتوں کے منکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں انھی اہل کتاب کی مدح کی گئی ہے جو بعد میں دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد اہل کتاب ہیں جو رسول اللہ پر ایمان لائے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن سلام اور حضرت سلمانؓ اور وہ لوگ مراد ہیں، جو نصاریٰ میں سے مسلمان ہوگئے اور وہ اسی (۸۰) سے کچھ زائد افراد تھے۔ چالیس (۴۰) شخص نجران کے تھے، آٹھ (۸) یمن کے اور بتیس (۳۲) حبشہ کے تھے۔ یہ لوگ قرآن مجید سے خوش ہوئے کیونکہ یہ لوگ قرآن مجید پر ایمان لائے تھے اور انھوں

نے قرآن مجید کی تصدیق کی تھی اور یہ جو فرمایا ہے اور ان گروہوں میں سے بعض وہ ہیں جو اس (نازل شدہ) کے بعض کا انکار کرتے ہیں اس سے مراد مشرکین ہیں۔ (۸)

مگر ہمارے نزدیک "مِنَ الْاَحْزَابِ" سے مراد یہود و نصاریٰ کی بعض جماعتیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں ہمارے مدعا پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(٦) کفر کے معنی جہاں مجرد انکار کے ہوتے ہیں وہیں حق کی مخالفت کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کی رو سے اصلی کافر وہ ہوتا ہے جو اہل حق پر ظلم کرتا ہے۔ جیسا کہ سورہ کہف میں آتا ہے:

قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ○ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ○ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰی(٩)

ہم نے کہا اے ذوالقرنین! چاہو تو سزا دو اور چاہو تو ان سے بھلائی کا معاملہ کرو اس نے کہا جو ظلم کرے ہم اسے سزا دیں گے۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے بہت بڑا عذاب دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور اچھے اعمال کیے تو اس کے بعد بہت اچھا بدلہ ہے۔

یہاں ایسے دو گروہوں کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام کے معاملے میں ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ ان کے متبعین کا ہوتا ہے اور دوسرا ان کے مکذبین و مخالفین کا۔ اسی گروہ کو اصل میں کافر کہا جاتا ہے۔ چونکہ ایسے ہی لوگ اہل حق پر ظلم کرتے ہیں۔ اس لیے آیت میں "اَمَّا مَنْ ظَلَمَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں ظلم سے مراد شرک نہیں بلکہ سرکشی اور اہل حق کی مخالفت ہے۔

اس آیت کا ترجمہ مولانا عبد الکریم اثری نے جن الفاظ میں کیا ہے وہ قابل توجہ ہے:

ذوالقرنین نے کہا: ہم نے نا انصافی کرنے والے نہیں، جو سرکشی کرے

گا اسے ضرور سزا دیں گے۔

اور اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

اور تاریخ نے اس کی وضاحت کر دی کہ اس مہم میں نہ تو اس کے ساتھ کسی نے زیادتی کی اور نہ ہی اس کی طرف سے کسی پر زیادتی کی گئی بلکہ امن اسی طرح بحال رہا جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا لیکن کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کیا ہوا۔ (۱۰)

اور عبد اللہ یوسف علی نے اپنی مختصر انگریزی تفسیر کے حاشیے میں ان آیات کے تعلق سے لکھا ہے:

He had great power and a great opportunity. He got authority over a turbulent and unruly people. Was he going to be severe with them and chastise them, or was he going to seek peace at any price, i.e, to wink at violance and injustice so long as it did protacl the weak and the innocent,he punished the guilty and the headstrong,but he remembered always that the true punishment would come in the hereafter, the true and final justice before the throne of Allah. (۱۱)

۷۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَیَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ (۱۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے رسول پر (بھی) ایمان لاؤ۔ اللہ تمھیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے گا اور تمھارے لئے ایسا نور بنادے گا، جس میں تم چلو گے اور تمھیں گناہوں سے بچائے گا

اور اللہ بہت حفاظت فرمانے والا ہے، بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ تا کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) جان لیں کہ انہیں اللہ کے فضل پر کچھ دسترس نہیں اور یہ کہ فضل، اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے عطا کرے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔

اس مقام پر یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ کے مخاطب، نصاریٰ ہیں جنکا ذکر آیت ما قبل میں "فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ" کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اور عبد اللہ یوسف علی کے الفاظ میں:

from the context before and after, This is hold to refer to the christians and people of the Book who kept their Faith true and undefiled. (۱۳)

اس آیت میں نصاریٰ کو پیغمبر اسلام پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر قرآن مجید کے الفاظ کی تفصیل کر دی جائے تو ترجمہ یا مفہوم یہ ہوگا:

اے وہ لوگو! جو مسیح پر ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اسکے رسول محمدؐ پر بھی ایمان لاؤ تو خدا تمھیں اپنی رحمت سے دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ (ایک اجر، سیدنا مسیحؑ کو ماننے کا اور دوسرا محمدؐ کو ماننے کا)۔

اس آیت کے مطابق اچھے اور سچے عیسائیوں پر اہل ایمان کا اطلاق کر کے آج بھی انھیں دعوت ایمان بالرسولؐ پیش کی جا سکتی ہے۔ "لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ" سے مراد یہاں یہود کو لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہود بر بنائے حسد رسول اللہ کے منکر ہوئے تھے۔ ان کا زعم تھا کہ وہ تنہا اللہ کے فضل کے حقدار ہیں۔ مطلب یہ کہ نبوت و رسالت ان کی نسل کے سوا کہیں اور نہیں جا سکتی۔ چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ، بنی اسماعیل میں پیدا ہوئے تھے نہ کہ بنی اسرائیل میں۔ اس لیے یہود نے آپؐ کی نبوت و رسالت کا انکار کیا۔ آیت کے زیر بحث الفاظ میں تعریضاً اسی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے، جسے ہم نے اپنے ترجمے کے بریکٹ میں ظاہر کیا ہے۔

سید انور علی نے اپنی تفسیر (انگریزی) میں اسی مفہوم کو نمایاں کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

In vrse 29 the believers, including the rightous ones among the Nasara who accepted the faith in the Holy Prophet, are told that they should not fear for the jealousy, harted, and opposition of the jews because they "have no power what ever over the Grace of Allah, and that (His) Grace is (totally) in His Hand, to bestow it on whomsoever He wills, and Allah is the lord of Grace abounding (verse 29).

Although the words Ahlal Kitab (people of the book) include both the believing christians as well as the believing jews, yet from the context of the verse,it appears that here the specific reference it to the Jews who were jealous of the Holy Prophet, and were refusing to accept his Prophethood, becuse, according to them the Prophet should have been from amongst the Bani Israil. It is really this claim of theirs which has been condemned in this verse, and said that "have no power whatever ower the Grace of Allah," i.e, the bestowing of Prophethood, but it is totally in the hands of Allah as to whom he may or may not give the Prophethood. Since Allah the almighty had chosen the Holy Prophet, as his Prophet, the believers and the righteous among the christians were not to be misled or deterred by the gealousy and baseless claim of the Jews. They should accept the faith in the Holy Propet and make their lives successful in this world as well as in the

Hereafter (۱۴)

(۸) وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ... (۱۵)

اور ہم نے فرشتوں کو ہی آگ کا نگران بنایا اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے آزمائش بنایا تا کہ وہ لوگ یقین حاصل کریں، جنہیں کتاب دی گئی اور جو ایمان لائے۔ وہ اپنے ایمان میں مزید ترقی کریں اور اہل کتاب اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں اور تا کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض (حسد) ہے اور کفار (دونوں) یہ کہیں کہ اللہ تعالی نے اس مثال کے ذریعے کس امر کا ارادہ کیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ (متوفی ۱۹۹۷ء) رقمطراز ہیں:

اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب مراد ہیں، اہل کتاب میں سے جو اپنی کتابوں پر واقعی ایمان رکھتے تھے، ان کے لئے قرآن کی اس طرح کی باتوں کا مذاق اڑانے کی گنجائش نہیں تھی۔ خود ان کے صحیفوں میں اس طرح کی باتیں موجود تھیں قرآن سے ان کی تائید مل گئی، جس سے ان کا یقین محکم ہوا۔ یہی اہل کتاب ہیں جو بعد میں قرآن پر ایمان لائے۔(۱۶)

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ اہل ایمان کے پہلو بہ پہلو اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔۔۔ اچھے اہل کتاب مسلمانوں ہی کے حکم میں تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالی نے شروع ہی سے ان کا ذکر اہل ایمان کے ہراول دستے کی حیثیت سے کیا تا کہ پہلے ہی سے ان پر واضح ہو جائے

کہ اس نئی بعثت کے دور میں انھیں کیا رول ادا کرنا ہے۔

آیات مذکورہ کی تفسیر میں اصلاحیؒ نے جو لکھا ہے وہی ہمارا بھی مختار ہے۔ ہم اسی بات کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اہل کتاب کا ایک گروہ آج بھی اسی تعریف کا مستحق ہے، اور صبح قیامت تک اہل کتاب میں ایسے سچے اور اچھے گروہ پیدا ہوتے رہیں گے۔اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سب غیر مسلموں کو یکساں نہ سمجھیں۔ ان خزف ریزوں میں ایسے قیمتی جواہر بھی پوشیدہ ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں ایمان بالرسول کے بعد ہم پیدائشی مسلمانوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔(۱۷)

(۹) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ O وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ O اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ O(۱۸)

وہ لوگ جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا فرمائی تھی، سو وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جب اس کتاب کی آیتیں ان پر پڑھی جاتی ہیں (تو) وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے۔ بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔ ہم تو پہلے ہی اسکے ماننے والے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کی ثابت قدمی پر دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔ یہ نیکی سے بدی کو دور کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب یہ لغویات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ پس ہمارا سلام لو۔ ہم شدت جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں سے الجھنا پسند نہیں کرتے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور رہے ہیں جن پر مومن کا اطلاق قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ امر دیگر ہے کہ انہی مومنوں کو بعد میں

قرآن پر ایمان کی توفیق بھی نصیب ہوئی۔ جس بناپر صالحین اہل کتاب کے رویے کی تحسین کی گئی ہے۔

انہی مومنین کی زبان سے یہ حقیقت کہلوائی گئی ہے کہ وہ اہل حق کے منکروں سے دین کی مخالفت میں فضول بات کرنے والوں سے اللہ کے قانون مکافات کو بیان کردیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں یعنی جو کچھ ہم کر رہے ہیں ہمیں اس کا نتیجہ ملے گا اور جو کچھ تم کر رہے ہو تمھیں اس کا نتیجہ اور بدلہ ملے گا۔ یعنی ہمارے اور تمھارے دونوں کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ثابت ہوں گے جو بالآخر جنت اور دوزخ پر منتج ہو جائیں گے۔

عبداللہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمے کے حاشیے میں لکھا ہے۔

There were Cristians and Jews who recognised that Islam was a logical and natural development of Allah,s revelations as given in earlier ages, and they not only welcomed and accepted Islam, but claimed, and rightly, that they had always been Muslims. In that sense Adam, Noah, Abraham, Moses, and Jesus had all been Muslims... Their credit is twofold, in that before they knew Islam, they followed the earlier Law in truth and sincerity, and when they were offered Islam, they reality recognised and accepted it, suffered in patient preservance for its sake and, brought forth the furis of rijhtousness. (۱۹)

یہ تینوں آیات اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام میں نہ صرف عہد رسالت مآبؐ میں داخل ہوئے بلکہ داخلے کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

مولانا غلام رسول سعیدی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

اس آیت (۵۳) میں جو فرمایا ہے کہ ہم پہلے ہی مسلمین تھے اس سے

اسلام کا معروف اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہے۔ یعنی ہم پہلے ہی اطاعت گزار اور اطاعت شعار تھے۔ اسلام کا معروف اصطلاحی معنی صرف دین اسلام ہے اور صرف مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔(۲۰)

واضح ہو کہ سعیدی صاحب نے اپنے آخری جملے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر علمائے اسلام کے دو مکتب موجود ہیں۔ ایک مکتب تو وہی، جو سعیدی صاحب نے اختیار کیا اور دوسرا مکتب ان لوگوں کا ہے، جو اسلام کا اطلاق تمام آسمانی مذاہب پر یکساں کرتے ہیں اور ان کے ماننے والوں کو ان کے اپنے دور کا بلا تفریق مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس لئے مولانا عبد الماجد دریابادیؒ (م ۱۹۷۷ء) نے لکھا ہے:

> مسلمین کے لفظ پر حیرت نہ کی جائے۔ ہر وہ شخص جو توحید و سلسلہ وحی کا قائل ہو مسلم کہا جاسکتا ہے الاسلام صفة کل موحد مصدق بالوحی (بحر)(۲۱)

مذکورہ بالا آیات سے اس نتیجے تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کو اب پوری دنیا میں ایک نئے انداز فکر اور طرز عمل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور بالخصوص تمام مذاہب کے پیرو کاروں کو اپنا دشمن سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ نیز اب مسلمانوں کو بہت واضح طور پر کافروں اور غیر مسلموں میں بھی فرق کرنا پڑے گا بلکہ شاید کہیں کہیں غیر مسلموں کو خود ان کے اپنے تناظر میں مسلمان بھی سمجھنا پڑے گا۔ واضح رہے کہ مثبت رویوں سے مثبت رویے جنم لیتے ہیں۔

قرآن چونکہ کسی دور کی مخصوص کتاب نہیں، یہ قیامت تک کے لیے ہے۔ اس لیے اس کی تمام ہدایات اسی طرح جاری اور مؤثر رہیں گی جس طرح اپنے زمانۂ نزول میں تھیں۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید نے اپنے نزول کے وقت جن غیر مذاہب کے بعض لوگوں کو اچھا اور عمدہ انسان متصور کیا ہے آج ہمیں اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرنا ہے تاکہ مسلمانوں کی دنیا بھر کے تمام انسانوں کے ساتھ مثبت Co-existance ہو سکے جس کی بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کو سخت ضرورت ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ النساء:۴۔۱۲۴

۲۔ البقرۃ:۲۔۱۳۱

۳۔ The Meaning of the Noble Quran with explanatory notes volume 1

۴۔ ایضاً حاشیہ نمبر ۵۵ زیر آیت ۱۳۱ (البقرہ) ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی اشاعت دوم ۲۰۰۴ء

۵۔ البقرۃ:۲۔۱۳۶

۶۔ الانعام:۶۔۱۱۴

۷۔ الرعد:۱۳۔۳۶

۸۔ تبیان القرآن، جلد ششم، سورہ رعد، ص ۴۰۵ فرید بک اسٹال، ۳۸۔ اردو بازار لاہور الطبع الاول ۲۰۰۲ء

۹۔ الکہف:۱۸۔۸۶ تا ۸۸

۱۰۔ تفسیر المدینۃ الثانی جلد پنجم، ص ۵۱۲، مکتبہ فاؤنڈیشن، جناح اسٹریٹ گجرات، اشاعت اول ۱۹۸۷ء۔

۱۱۔ سورہ کہف حاشیہ نمبر ۲۲۳۱، کنگ فہد ہولی قرآن پرنٹنگ کمپلیکس، المدینۃ المنورہ، ۱۴۱۵ھ

۱۲۔ الحدید: ۵۷۔۲۸،۲۹

۱۳۔ سورہ حدید، حاشیہ نمبر ۵۳۴۵، ایضاً

۱۴۔ Quran- The fundamental law of Human life. vol 14 page no 932 بیت الحکمۃ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، پاکستان، اشاعت اول ۱۹۹۰ء

۱۵۔ مدثر:۷۴۔۳۱

۱۶۔ تدبر قرآن، جلد نہم، ص ۵۵، فاران فاؤنڈیشن، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۳ء

۱۷۔ ایضاً۔۔۔ص ۵۸

۱۸۔ القصص:۲۸۔۵۲ تا ۵۵

۱۹۔ سورہ قصص، حاشیہ نمبر ۳۳۸۵۔۳۳۸۶

۲۰۔ تبیان القرآن، جلد ہشتم، ص ۶۸۲، فرید بک اسٹال، ۳۸ اردو بازار، لاہور، الطبع اول ۲۰۰۲ء

۲۱۔ تفسیر ماجدی جلد اول سورہ قصص، حاشیہ نمبر ۴۳، تاج کمپنی لمیٹڈ، سن اشاعت درج نہیں۔

سید انور علی نے اپنی انگریزی تفسیر میں لفظ مسلم کے عمومی استعمال پر مفصل و مدلل کلام کیا ہے۔
ملاحظہ کیجئے: Quran- the fundamenlal Law of Human life. vol no . 10. page 445-446

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹ شمارہ ۱۷، جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء

حیاتِ دنیا کے حوادث اور مؤمنانہ طرزِ عمل

(سورۃ الحدید آیات ۲۲ تا ۲۴ کی روشنی میں)

انجینئر نوید احمد

Abstract

Demeanor of a Mo'min During Incidents of Worldly Life (vis-à-vis Surah AlHadeed Ayaat 22 to 24)

Every person goes through various incidents and ever-changing situations in worldly life. There are occurrences of mishaps or blissful events. Allah (swt) has created three dimensions, the first one is our worldly dimension, the second is a heavenly dimension and the third one is a dimension of Hell. Heaven is an abode of of eternal comfort, contrary to Hell which is a place of eternal sufferings. The worldly dimension is a mix of bliss and miseries and they are in parallel to each other. At times a Mo'min and a non-believer can take the rap of these two

opposing circumstances. A responsive reaction to these circumstances is something which differentiates a Mo'min from a non-believer and that is how it should be. The triad of Muslim belief is on almighty Allah(swt), on hereafter and on a fate, predestined by Allah (swt), however a non-believer is deprived of such blessings. The belief in Allah (swt) and the predestined fate brings an inner peace and solace to a Muslim, since Eemaan, the Arabic equivalent of belief means to give Aman (which means peace in Arabic). A Mo'min neither goes into a continuous state of melancholia or apathy, nor is he overrun by an utter dejection, which may lead him to a state of everlasting despair. How a Mo'min should carry himself in situations of worldly mishaps? Qur'aan and books of Ahadith give us an in-depth guidance in this regard. In the following article this guidance vis-à-vis Ayaat 22 to 24 of Surah AlHadeed and few Ahaadith is submitted.

حیاتِ دُنیوی کے دوران ہر انسان کو مختلف حوادث اور بدلتے ہوئے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ تکلیف دہ واقعات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں اور مسرت بخش لمحات بھی آتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تین عالم بنائے ہیں۔ ایک یہ دنیا کا عالم ہے، دوسرا عالم جنت ہے اور تیسرا عالم جہنم۔ جنت ایسا عالم ہے جہاں راحتیں ہی راحتیں ہیں۔ جہنم ایسا عالم ہے کہ جہاں پر تکالیف ہی تکالیف ہیں۔ عالم دنیا میں راحتیں بھی ہیں اور تکالیف بھی۔ دونوں چیزیں ساتھ

ساتھ چلتی ہیں۔ تکلیف یا راحت مسلمان کو بھی پہنچتی ہے اور کافر کو بھی۔ البتہ اس حوالے سے ایک مسلمان اور ایک کافر کے ردِعمل میں فرق ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان اللہ‘ آخرت اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہے جبکہ کافر اس نعمت سے محروم ہے۔ حیاتِ دنیا کے حوادث پر مؤمنانہ طرزِ عمل کے حوالے سے سورۃ الحدید کی آیات ۲۲ تا ۲۴ میں ایمان افروز رہنمائی دی گئی ہے۔ آیت ۲۲ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴾

’’نہیں پڑتی کوئی آفت زمین پر اور نہ ہی خود تم پر مگر ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے قبل اس کے کہ ہم اُسے ظاہر کریں۔ بے شک ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔‘‘

اس آیت میں حوادث کے لیے لفظ ’’مصیبت‘‘ آیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں وارد ہونے والی شے خواہ وہ خوشگوار ہو یا تکلیف دہ۔ عام طور پر تکلیف دہ معاملہ کا انسان زیادہ تاثر لیتا ہے لہٰذا ’’مصیبت‘‘ کا لفظ اکثر صرف اسی صورت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خوشگوار یا تکلیف دہ حوادث زمین پر بھی وارد ہوتے ہیں اور کسی انسان پر بھی۔ زمین پر اس کی صورت بارانِ رحمت‘ فرحت بخش ہواؤں اور اچھی فصلوں یا زلزلے‘ طوفانی بارشوں‘ ژالہ باری‘ سیلاب‘ سمندری طوفان‘ تیز ہواؤں‘ خراب فصلوں وغیرہ کی ہوتی ہے۔ انسان پر اس کا ورود کامیابیوں یا ناکامیوں‘ مال و جان کے نقصان اور بیماریوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس آیت میں رہنمائی عطا کی گئی ہے کہ:

۱) زمین اور انسانوں پر وارد ہونے والے حوادث اللہ کے حکم سے وارد ہوتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اور اس میں جاری مختلف معاملات کسی اندھے بہرے مادّہ کی کارفرمائی نہیں ہیں۔ ایک حکیم و دانا ہستی اس کائنات کی خالق ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے اذن سے ہو رہا ہے۔ دنیا میں نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ جب تک اللہ کا اذن نہ ہو۔ ترمذی میں روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو تاکید فرمائی:

((اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰہَ‘ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ‘ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِ

اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ لَکَ‘ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیْکَ‘ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) (۱)

’’جب تو سوال کرے تو صرف اللہ سے سوال کر‘ جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے مدد طلب کر‘ اور یہ بات جان لے کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے کچھ فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے طے کر دیا‘ اور اگر وہ جمع ہو کر تجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے طے کر دیا۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں‘‘۔

ہر واقعہ کے پیچھے بظاہر کچھ اسباب نظر آتے ہیں لیکن اسباب کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی ہے۔ جو بھی حالات وارد ہو رہے ہیں اُن میں بظاہر کوئی بھلائی یا برائی اپنے لیے نمارہا ہے لیکن ان کے پیچھے اصل فاعلِ حقیقی صرف اور صرف اللہ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ڈاکٹر نے غلط انجکشن لگا دیا ہو‘ ممکن ہے کہ کسی نے وار کیا ہو اور انسان اُس وار سے ہلاک ہو گیا‘ لیکن یہ سب کا سب ہو نہیں سکتا تھا جب تک اللہ تعالیٰ کا اذن نہ ہو۔ موت کا وقت اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا ہے۔ جب تک موت کا وقت نہ آئے‘ انسان مر نہیں سکتا۔ حضرت علیؓ کا بڑا حکیمانہ قول ہے:

اَلْمَوْتُ خَیْرُ الْحَافِظَۃِ وَالْمَوْتُ خَیْرُ الْوَاعِظَۃِ

’’موت بہترین محافظ ہے اور موت ہی بہترین واعظ ہے۔‘‘

موت محافظ اس معنی میں ہے کہ اس کا وقت طے ہے لہٰذا جب تک اس کا وقت نہیں آتا‘ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ موت بہترین واعظ ہے‘ یعنی اگر انسان کو موت یاد رہے تو پھر اُس کی زندگی کا رُخ صحیح ہو جاتا ہے۔

۲) جو واقعات بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں وہ پہلے سے ایک کتاب یعنی کتابِ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ معاملہ مشکل نظر آتا ہے لیکن واضح کیا گیا کہ: ﴿اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ﴾ ’’بے شک یہ اللہ پر بہت آسان ہے‘‘۔ اگر اللہ کی ذات و صفات کی بے حد وحساب

وسعت سامنے ہو تو اس حوالے سے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

مذکورہ بالا دو حقائق سامنے ہوں تو اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے وہ آیت ۲۳ میں بیان ہوا :

﴿لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝﴾

''تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو شے تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اور نہ اتراؤ اُس پر جو تم کو وہ (اللہ) عطا کرے' اور اللہ پسند نہیں کرتا خود کو کچھ سمجھنے والے اور بڑائی کرنے والے کو۔''

مسلمان جب اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ ہر معاملہ اللہ ہی کے حکم سے ظہور پذیر ہوا اور کتابِ تقدیر میں وہ پہلے ہی سے درج تھا تو اب نہ وہ ناخوشگوار حالات پر شدتِ غم سے نڈھال ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کامیابی پر اتراتا اور اکڑتا ہے۔ اس کی وجہ مذکورہ بالا دو نکات کے حسب ذیل مضمرات ہیں :

۱) عام آدمی کو اگر کوئی تکلیف آتی ہے تو وہ اسے کسی دیوتا کی ناراضگی یا اسباب کے مخالف ہونے کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اگر اُسے کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے تو اسے کسی دیوتا کی نظرِ کرم یا اسباب کے موافق ہونے کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کے ظہور کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی گمراہی ہے۔ ہدایت کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ اسے اللہ کی طرف منسوب کیا جائے۔ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی کے مطابق ہر نعمت اللہ دیتا ہے اور تکلیف بھی وہی دیتا ہے۔ خیر ہو یا شر' خوشگوار حالات ہوں یا ناگوار' جو بھی ہے من جانب اللہ ہے۔ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا' لہٰذا نقصان کی صورت میں اسباب کے خلاف پیچ و تاب اور انتقام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی خیر ملی ہے تو وہ اللہ کا فضل ہے نہ کہ انسان کا اپنا کمال۔ لہٰذا انسان میں نہ تکبر کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اتراتا اور اپنی بڑائی کرتا ہے۔

۲) اس کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے تمام معاملات پہلے ہی سے طے شدہ اور علمِ خداوندی میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہاں کوئی واقعہ ممکن ہے ہمارے لیے حادثہ ہو' درحقیقت حادثہ نہیں

ہے۔ کوئی بات انہونی نہیں ہے۔ جو تکلیف آئی ہے وہ اپنے طے شدہ وقت پر آنی ہی تھی اور تقدیر میں لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔

۳) اللہ کے ہر فیصلہ میں ضرور کوئی خیر پوشیدہ ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے' اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے' ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے' بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

ہم اپنے ناقص علم کی وجہ سے اللہ کے فیصلہ کے خیر کے پہلو کو سمجھ نہیں سکتے لیکن اللہ کے فیصلہ میں ضرور ہماری بہتری ہوتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَـيْـــًٔـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''تم پر (اللہ کی راہ میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے خواہ وہ تمہیں ناگوار ہو' ممکن ہے تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو' اور ممکن ہے تم کسی شے کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہو' اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

سورۃ التوبہ میں منافقین کو اہل ایمان کی طرف سے آگاہ کیا گیا:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ

بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴾

''(اے نبیؐ) کہہ دیجئے ہمیں ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لیے وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ کہہ دیجئے کہ تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو بھلائیوں میں سے ایک کی' اور ہم تمہارے حق میں منتظر ہیں کہ بھیجے اللہ تم پر کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں۔ سو انتظار کرو' ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔''

حدیث مبارکہ ھے : ((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ)) (۲)

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے' اُس کے ہر معاملے میں خیر ہے' اور یہ چیز مومن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اُسے نعمت ملے وہ شکر کرتا ہے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے' اور اگر اُسے تکلیف پہنچتی ہے وہ صبر کرتا ہے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہمارا ہم سے بڑھ کر خیر خواہ اور ہماری مصلحتوں کا ہم سے بہتر جاننے والا ہے۔ بقول شاعر:

کار ساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

''ہمارا کارساز ہمارے مسائل کے حل کا دھیان رکھتا ہے۔ ہمارا بذاتِ خود اپنے مسائل کے حل کے بارے میں متفکر ہونا ہمیں پریشان کر دیتا ہے۔''

ہمیں اس دنیا میں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے اگر ہم نے اُس پر صبر کیا تو وہ روزِ قیامت ہمارے گناہوں کا کفارہ اور ہمارے حق میں باعثِ اجر و ثواب ہوگی۔ ارشاداتِ نبویؐ ہیں:

((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّصِبْ مِنْهُ)) (۳)

''جس بندے کے بارے میں اللہ خیر کا فیصلہ فرماتا ہے اُسے مصیبت سے دوچار کر دیتا ہے۔''

((اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ اَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهٖ حَتّٰى يُوَافِيَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۴)

''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس کو (اُس کے گناہوں کی سزا) جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آزمائشوں کے ذریعے سے اُس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے) اور جب اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے اُس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے' یہاں تک کہ قیامت والے دن اُس کو پوری سزا دے گا''۔

نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا:

((اِنَّ عِظَمَ الْجَزَآءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَاِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا اِبْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ)) (۵)

''آزمائش جتنی عظیم ہوگی بدلہ بھی اسی قدر عظیم ہوگا' اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتا ہے تو اُس کو آزمائش سے دوچار فرما دیتا ہے' پس جو (اُس سے) راضی ہوتا ہے اُس کے لیے (اللہ کی) رضا ہے اور جو (اُس آزمائش کی وجہ سے اللہ سے) ناراض ہوتا ہے اُس کے لیے (اللہ کی) ناراضی ہے۔''

((يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: مَا لِعَبْدِي الْمُؤْمِنِ عِنْدِي جَزَاءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهٗ مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهٗ اِلَّا الْجَنَّةُ)) (۶)

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں جب اپنے مومن بندے کے اہلِ دنیا میں سے کسی پیارے کو واپس لے لیتا ہوں لیکن وہ اُس پر ثواب کی نیت (سے صبر و رضا کا مظاہرہ) کرتا ہے تو اُس کے لیے میرے پاس جنت کے سوا کوئی بدلہ نہیں ہے۔''

((مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَّلَا وَصَبٍ وَّلَا ھَمٍّ وَّلَا حُزْنٍ وَّلَا اَذًی وَّلَا غَمٍّ حَتّٰی الشَّوْکَۃِ یُشَاکُھَا اِلَّا کَفَّرَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ خَطَایَاہُ)) (۷)

''مسلمان کو جو بھی تکان، بیماری، فکر، غم اور تکلیف پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔''

((اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃٌ لَمْ یَبْلُغْھَا بِعَمَلِہٖ ابْتَلَاہُ اللّٰہُ فِیْ جَسَدِہٖ اَوْ فِیْ مَالِہٖ اَوْ فِیْ وَلَدِہٖ —— قَالَ ابو داوٗد زَادَ ابْنُ نُفَیْلٍ ثُمَّ صَبَّرَہٗ عَلٰی ذٰلِکَ ثُمَّ اتَّفَقَا —— حَتّٰی یُبْلِغَہُ الْمَنْزِلَۃَ الَّتِیْ سَبَقَتْ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی)) (۸)

''کسی بندۂ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل (مجاہدے) سے نہیں پا سکتا تو اللہ تعالیٰ اُس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ یا پریشانی (غیر اختیاری مجاہدے) میں مبتلا کر دیتا ہے، پھر اُس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے، یہاں تک کہ اُسے اُس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اُس کے لیے پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے''۔

سورۂ کہف میں ایک قصہ کے ذریعہ واضح کیا گیا کہ واقعات کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے لیکن اُن کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اس قصہ میں تین واقعات ایسے آئے ہیں کہ جن کا ظاہر شر محسوس ہوتا تھا لیکن اُن کی حقیقت خیر تھی۔ حضرت موسیٰ d، حضرت خضر d کے ساتھ ایک کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ حضرت خضرؑ نے کشتی کا ایک تختہ نکال کر پھینک دیا۔ بظاہر یہ کام ظلم تھا لیکن حضرت خضرؑ نے وضاحت کی کہ ایک بادشاہ صحیح سالم کشتیوں کو غصب کر تا آ رہا تھا۔ اگر یہ کشتی سالم ہوتی تو بادشاہ چھین لیتا۔ گویا ایک تختہ ضائع ہو گیا لیکن پوری کشتی بچ گئی۔ اس کے بعد ایک بچے کو حضرت خضرؑ نے قتل کر دیا۔ بظاہر یہ قتل ناحق تھا لیکن حضرت خضرؑ نے بتایا کہ اس بچے نے بڑے ہو کر اپنے والدین کے لیے وبالِ جان بننا تھا۔ وہ اپنا بھی نامۂ اعمال سیاہ کرتا اور والدین کو بھی پریشان کرتا۔ اللہ تعالیٰ والدین کو اس سے بہتر بچہ عطا فرمائے گا۔ اس کے بعد

حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ ایک بستی میں پہنچے۔ بستی والوں نے ان مسافروں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ حضرت خضرؑ نے بستی میں ایک ایسی دیوار تعمیر کر دی جو بالکل گرنے والی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اعتراض کیا کہ آپ نے بغیر معاوضے کے بخیل بستی والوں کا یہ کام کر دیا۔ حضرت خضرؑ نے وضاحت کی کہ اس دیوار کے نیچے دو یتیم بچوں کی وراثت ایک خزانہ کی صورت میں دفن ہے۔ اگر دیوار گر جاتی تو وہ خزانہ بخیل بستی والوں کے ہاتھ میں آ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ دیوار تعمیر کرا دی تاکہ حق داروں کو اُن کا حق مل جائے۔ آخر میں حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ میں نے سب کچھ اللہ کے حکم سے کیا اور یہ سب اللہ کی رحمت کے مظاہر ہیں۔

۴) اس دنیا کی ہر راحت یا تکلیف عارضی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ ط وَلَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل)

''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے (یعنی کبھی ختم نہیں ہوگا)۔ اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم اُن کو اُن کے اعمال کا نہایت اچھا بدلہ دیں گے۔''

اگر کوئی شے ہم سے چھن گئی ہے تو اُس نے ایک روز فنا ہونا ہی تھا۔ دُنیوی زندگی تو ہے ہی بڑی محدود۔ اصل زندگی تو ہے ہی آخرت کی۔ انسان کی تمنا یہ ہونی چاہیے کہ اے اللہ ہمیں آخرت کی نعمتیں عطا فرما۔ ہمیں اپنے مرنے والے عزیزوں کا جنت میں ساتھ عطا فرما۔ جنت کا ساتھ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور دنیا کا ساتھ تو لازمی ختم ہوگا۔ آج اگر ہمارے کسی عزیز کا انتقال ہوا ہے تو اُس نے ایک روز مرنا ہی تھا اور ہمیں بھی کسی روز یہاں سے رخصت ہونا ہی ہے۔ اسی لیے مصیبت پر یہ کلمات پڑھنا مسنون ہے کہ: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ جانا ہے)۔

ایک بادشاہ نے شاندار محل بنوایا اور ایک درویش کو اُس محل کے نظارہ کی دعوت دی۔ درویش نے تبصرہ کیا کہ اگر کسی طرح دو باتوں کا ازالہ ہو جائے تو پھر یہ محل بہت ہی عمدہ ہے۔ پہلی یہ کہ محل کے بارے میں ضمانت مل جائے کہ یہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسری یہ کہ بادشاہ

سلامت بھی ہمیشہ اس محل میں رہ سکیں گے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ محل یہیں رہے گا اور بادشاہ سلامت دنیا سے چلے جائیں گے اور یا بادشاہ سلامت کے سامنے کوئی آفت اس محل کو برباد کر دے گی۔

۵) اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی ہمیں عطا ہی اس لیے کی ہے کہ وہ ہمارا امتحان لے۔ ازروئے الفاظ قرآنی:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک : ۲)

''اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے۔''

علامہ اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

تلزم ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس دنیا میں انسان پر جو اچھے یا برے حالات آتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کی طرف سے ایک امتحان وآزمائش کا ذریعہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ.﴾ (الانبیاء)

''اور ہم تمہیں آزماتے ہیں شر اور خیر سے جو آزمائش کی صورتیں ہیں' اور تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔''

اس حقیقت کو بڑے مؤثر اسلوب میں بیان کیا گیا سورۃ الفجر کی آیات ۱۵ اور ۱۶ میں:

﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ. وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴾

''پس انسان (کا معاملہ عجیب ہے کہ) جب اُس کا پروردگار اُس کو آزماتا ہے تو اُسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی۔ اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اُس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو یہ کہتا

ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا۔''

درحقیقت دنیوی زندگی میں نہ تو خوشحالی عزت کی علامت ہے اور نہ ہی تنگدستی ذلت کا مظہر۔ یہ دونوں صورتیں امتحان اور آزمائش کی ہیں۔ اللہ ہر پہلو سے انسان کو جانچتا ہے۔ کبھی وہ دے کر آزماتا ہے اور کبھی چھین کر۔ ایک شکر کا امتحان ہے اور دوسرا صبر کا۔ کبھی اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ بندہ شکر کرتا ہے یا نہیں۔ کہیں عیش میں اللہ کو بھول تو نہیں جاتا۔ بقول شاعر: ؎

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا' وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا!

کبھی اللہ تعالیٰ تکلیف دیتا ہے یہ جانچنے کے لیے کہ بندہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔ قرآن حکیم میں بار بار نیک بندوں کی صفات آئی ہیں صبار اور شکور۔ نعمتوں کے ملنے پر ہمیں شکر کرنا چاہیے اور تکلیف آنے پر صبر۔ مصائب پر شور و واویلا کرنے' مرثیہ پڑھنے اور اللہ سے شکوہ یا شکایت کرنے سے مرنے والے واپس نہیں آتے اور نقصانات کی تلافی نہیں ہوتی' لیکن ہم اجر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض خواتین غم کے موقع پر اس انداز سے مرنے والے کی باتیں یاد دلاتی ہیں یا نوحہ پڑھتی ہیں کہ اس سے صدمہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ عمل اللہ کو پسند نہیں' کیونکہ ایسا کرنا اللہ کے فیصلہ پر عدم اطمینان کا اظہار ہے۔ اس حوالے سے حضرت ابوموسیٰ h روایت کرتے ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَرِئَ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ(۹)

''بے شک اللہ کے رسول ﷺ اُس عورت سے بیزار ہیں جو نوحہ کرنے والی' (مصیبت کی وجہ سے) سر منڈانے والی اور گریبان چاک کرنے والی ہو۔''

((اَلنَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ قَطِرَانٍ وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ))(۱۰)

''بین کرنے والی عورت' اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اُسے قیامت کے دن اس طرح کھڑا کیا جائے گا کہ اُس پر تارکول کا کرتہ اور خارش کی زرہ ہوگی۔''

((اِثْنَتَانِ فِی النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: الطَّعْنُ فِی النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ)) (۱۱)

''دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں جو اُن کے حق میں کفر ہیں۔ نسب میں طعنہ زنی کرنا اور میت پر بین کرنا۔''

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ)) (۱۲)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے رخساروں کو پیٹا اور گریبانوں کو چاک کیا اور جاہلیت کے بول بولے (یعنی بین کیا)۔''

((عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: اَخَذَ عَلَيْنَا النَّبِیُّ ﷺ عِنْدَ الْبَيْعَةِ اَنْ لَا نَنُوْحَ))(۱۳)

حضرت اُم عطیہ k بیان فرماتی ہیں کہ'' رسول اللہ ﷺ نے بیعت کے وقت ہم سے یہ عہد لیا کہ ہم بین نہیں کریں گی۔''

عَنْ اَسِيْدِ بْنِ اَبِیْ اَسِيْدٍ عَنِ امْرَاَةٍ مِنَ الْمُبَايِعَاتِ قَالَتْ: ((كَانَ فِيْمَا اَخَذَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِی الْمَعْرُوْفِ الَّذِیْ اَخَذَ عَلَيْنَا اَنْ لَا نَعْصِيَهُ فِيْهِ اَنْ لَا نَخْمُشَ وَجْهًا وَّلَا نَدْعُوَ وَيْلًا وَّلَا نَشُقَّ جَيْبًا وَّاَنْ لَا نَنْشُرَ شَعْرًا))(۱۴)

''حضرت اُسید بن ابی اُسید اُس عورت سے روایت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے والوں میں سے تھی۔ اُس نے بیان کیا کہ وہ بھلائی کے کام جن کے کرنے کا اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے عہد لیا تھا' اُن میں یہ عہد بھی تھا کہ ہم اللہ کی نافرمانی نہ کریں' چہرہ نہ نوچیں' ہلاکت کی بددعا نہ کریں' گریبان چاک نہ کریں اور بال نہ بکھیریں۔''

پھر اصل صبر وہ ہے جو فوری طور پر کیا جائے ورنہ شکوے شکایات کرنے کے بعد صبر تو کرنا ہی پڑتا ہے اور اُس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بخاری اور مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا :

مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ بِامْرَاَةٍ تَبْكِیْ عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ: ((اِتَّقِی اللّٰهَ وَاصْبِرِیْ)) قَالَتْ:

اِلَيْكَ عَنِّیْ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِيْبَتِیْ ' وَلَمْ تَعْرِفْهُ ' فَقِيْلَ لَهَا اِنَّهُ النَّبِیُّ ﷺ فَاَتَتْ بَابَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَّابِيْنَ فَقَالَتْ: لَمْ اَعْرِفْكَ' فَقَالَ : ((اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى))(۱۵)

''نبی کریم ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپؐ نے اُس سے فرمایا:'' اللہ سے ڈر اور صبر کر''۔ اُس نے کہا: مجھ سے دور ہو جا! تجھے وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے۔ اُس نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں پہچانا (اس لیے فرطِ غم میں اُس نے نازیبا انداز اختیار کیا)۔ بعد میں اُسے بتلایا گیا کہ وہ تو نبی ﷺ تھے۔ چنانچہ (یہ سن کر) وہ آپؐ کے دروازے پر آئی' وہاں دربانوں کو نہیں پایا' (آکر) اُس نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ آپؐ نے (اُسے پھر وعظ کرتے ہوئے) فرمایا:'' صبر تو یہی ہے کہ صدمے کے آغاز میں کیا جائے (بعد میں تو صبر آ ہی جاتا ہے)۔''

۲) آخرت میں جواب دہی کے حوالے سے صبر کا امتحان شکر کے امتحان کے مقابلہ میں آسان ہے۔ وہ آزمائش نسبتاً آسان ہے جس میں اللہ نے کچھ چھین کر آزمایا ہو' بجائے اس کے کہ اللہ نے کچھ دے کر امتحان لیا ہو۔ روزِ قیامت ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ کے مطابق ایک ایک نعمت کے حوالے سے جوابدہی کرنی ہوگی۔ زندگی' مال اور اولاد کے حوالے سے باز پرس ہوگی۔ اس دنیا میں ان نعمتوں کی جتنی فروانی ہوگی اتنا ہی حساب دینا یعنی account for کرنا بھاری ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر انسان کے پاس دنیوی نعمتیں کم ہیں تو انسان کے لیے جوابدہی کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں :

((اِطَّلَعْتُ فِی الْجَنَّةِ فَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا الْفُقَرَاءَ وَاطَّلَعْتُ فِی النَّارِ فَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَاءَ))(۱۶)

''میں نے جنت میں دیکھا تو اُس میں اکثر تعداد فقراء کی تھی اور جہنم میں دیکھا تو اُس میں اکثر تعداد عورتوں کی تھی۔''

((یَدْخُلُ الْفُقَرَاءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِیَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ ......)) (۱۷)

''فقراء جنت میں مالداروں سے پانچ سو برس قبل داخل ہوں گے۔''

((یَوَدُّ اَهْلُ الْعَافِیَةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حِیْنَ یُعْطٰی اَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِی الدُّنْیَا بِالْمَقَارِیْضِ)) (۱۸)

''قیامت کے دن جب اُن بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے' ان مصائب کے عوض اجر و ثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام اور چین سے رہے' حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں''۔

صبر کی آزمائش کے نسبتاً آسان ہونے کے حوالے سے امام احمد بن حنبلm کا واقعہ ہے کہ خلق قرآن کے مسئلہ میں اُن پر تشدد ہو رہا تھا اور پیٹھ پر کوڑے برس رہے تھے' ایسے کوڑے کہ اگر ہاتھی کو مارے جاتے تو وہ بھی بلبلا اٹھتا ' لیکن آپ نے اس پر نہ اُف کی اور نہ آنسو بہائے۔پھر وہ وقت آیا کہ نئے خلیفہ نے تلافی کے لیے آپ کے گھر پر اشرفیوں کا بھرا ہوا تھیلا بھیجا تو آپ رونے لگے اور فرمایا :اے اللہ! میں اس آزمائش کا اہل نہیں ہوں' یہ زیادہ بڑی آزمائش ہے' اس میں کامیاب ہونا زیادہ مشکل ہے۔

البتہ اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ ہم دعا کریں کہ اے اللہ ہمیں بھی صبر کے امتحان میں ڈال دے۔ایسی آرزو کرنا اپنے آپ کو بہادر ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مشکل آجائے اور ہم صبر نہ کرسکیں۔ اللہ سے ہمیشہ عافیت ہی مانگنی چاہیے۔البتہ اگر کوئی تکلیف آہی جائے' کوئی صدمہ پہنچ ہی جائے یا کوئی نقصان ہو ہی جائے تو آدمی اُس پر یہ سوچ کر صبر کرلے کہ اس امتحان کا اجر اللہ کے ہاں زیادہ ہے' اگر میں اس پر صبر کرلوں اور اللہ سے کوئی شکوہ و شکایت نہ کروں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے:

مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ بِرَجُلٍ وَهُوَ یَقُوْلُ : اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الصَّبْرَ فَقَالَ ﷺ :
((قَدْ سَاَلْتَ الْبَلَاءَ فَسَلِ اللّٰهَ الْعَافِیَةَ)) (۱۹)

''حضور نبی اکرم ﷺ کا گزر ایک شخص پر سے ہوا' جو دعا کر رہے تھے : اے اللہ !مجھے صبر دے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:'' تم نے اللہ سے آزمائش مانگی ہے'پس اللہ سے عافیت کا سوال کرو۔''

مسنون دعا ھے : ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ وَالْمُعَافَاةَ وَحُسْنَ الْیَقِیْنِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ))

''اے اللہ! میں آپ سے دنیا اور آخرت کے لیے سوال کرتا ہوں بخشش' تندرستی لوگوں کے شرور سے حفاظت اور عمدہ یقین کا۔''

﴿لِكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ﴾ (تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو شے تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے) کے الفاظ رہنمائی دے رہے ہیں کہ مذکورہ بالا حقائق کا ادراک ہو تو انسان کسی عزیز کے انتقال' کسی مالی نقصان اور کسی موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا ایسا تأثر نہیں لیتا کہ اپنے بال نوچے' گریبان پھاڑے' سر دیوار سے ٹکرائے'سر پر خاک ڈالے'نوحے یا مرثیے پڑھے'اللہ سے شکوے کرے یا زمانے کو مورد الزام ٹھہرائے کہ:

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

مذکورہ بالا حقائق کا شعور بندۂ مؤمن میں تسلیم و رضا کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک عام انسان کی نگاہ صرف اسباب پر ہوتی ہے اور وہ اچھے یا برے حالات کا بہت زیادہ تأثر لیتا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی:

﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ یَئُوْسًا﴾ (بنی اسرائیل)

''اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو اعراض کرتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے' اور جب اُسے سختی پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔''

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا﴾ (المعارج)